از جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب

بھارت کا تازہ سفرنامہ

سہارنپور - کلیر شریف - منگلور - ہردوار - رشی کیش

اگلے روز میں ناشتہ کر کے بازار چوب فروشاں میں مدرسہ مظاہر العلوم دیکھنے گیا۔ وہاں میری ملاقات علیم اللہ ناظم کتاب خانہ سے ہوئی۔ انہوں نے میرا تعارف شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب سے کرایا۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن موصوف برہان کے حوالے سے مجھ سے متعارف تھے۔ انہوں نے چائے سے میری تواضع کی اور دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ شیخ الحدیث بالکل نوجوان ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے کسی مدرسے میں اتنا نوعمر شیخ الحدیث نہیں ہے۔ موصوف کھیتا سرائے ضلع جونپور کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ طالب علم مظاہر العلوم میں ہیں۔ اور ان میں اکثریت گجراتی، بہاری اور بنگالی طلبہ کی ہے۔

ناظم کتاب خانہ نے مجھے مدرسے کی خوبصورت مسجد دکھائی جو کلثوم نامی ایک مخیر خاتون نے بنوائی ہے اور اسی کے نام سے منسوب ہے۔ طلبہ کا ایک ہاسٹل اسی بازار میں تھوڑے سے فاصلے پر ہے اور اس کی مسجد بڑی وسیع ہے۔ اسی مسجد میں حضرت مولانا محمد زکریا مرحوم و مغفور اپنے متوسلین کے ساتھ اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔

مظاہر العلوم سے فارغ ہو کر میں بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ اور رڑکی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں بس رڑکی پہنچ گئی۔ بس اسٹینڈ سے میں ایک رکشا میں سوار ہو کر نہر کے پل پر پہنچا۔ وہاں کلیر شریف جانے کے لیے رکشے ہر وقت ملتے ہیں۔ رڑکی سے کلیر شریف کا فاصلہ سات کلومیٹر ہے اور تین روپے میں رکشا والے وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ رڑکی سے کلیر شریف تک نہر کے کنارے کنارے جاتے ہیں اسی نہر کے بارے میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے فرمایا تھا کہ اس کے پانی میں انوار نبوت دکھائی دیتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا پانی کسی نبی کی قبر کے پاس سے گذر کر آتا ہے۔

میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب کلیر شریف پہنچا۔ اس وقت جمعہ کی اذان ہو رہی تھی۔ اذان کے بعد درگاہ کے احاطے میں نوبت بجنے لگی۔ میرے استفسار پر نقارچی نے بتایا کہ وہاں جمعہ کی نماز کے لئے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے نوبت بجائی جاتی ہے۔ میں نے درگاہ کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ اور نماز کے بعد حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ کے مزار پہ فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا۔

حضرت صابرؒ کا مزار ایک وسیع احاطے کے وسط میں واقع ہے۔ مزار پر ایک سفید گنبد بنا ہوا ہے جس میں سبز دھاریاں بڑی خوب صورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ روضہ مبارک کے چاروں کونوں میں برجیاں تعمیر کی گئی ہیں مزار شریف کے گرد غلام گردش بنا ہوا ہے جس میں زائرین قرآن خوانی اور ذکر و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں۔

درگاہ کی مسجد میں وضو کا بڑا اچھا انتظام ہے لیکن طہارت خانہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے زائرین استنجا کے لئے باہر کھلے میدان میں جاتے ہیں۔ اور وہاں بڑی بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کاش یوپی وقف بورڈ اس طرف بھی توجہ دے۔ درگاہ کی حدود میں مسلمان بی بیاں بے پردہ گھومتی ہیں کم از کم ایسی جگہوں پر عورتوں کے یوں کھلے بندوں گھومنے پھرنے پر پابندی عائد کرنی چاہئے۔

یوپی وقف بورڈ نے درگاہ کے قریب ایک پرائمری اسکول کھولا ہوا ہے۔ درگاہ سے باہر متعدد دکانیں ہیں جہاں تبرکات اور کھانے پینے کی اشیاء مل جاتی ہیں۔ کلیر شریف کی مختصر سی آبادی پر جنگل میں منگل کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔

حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ سے چشتیہ صابریہ طریقہ کی اشاعت ہوئی۔ ان کے واحد خلیفہ حضرت شمس الدین ترکؒ پانی پتی[1] سے حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتیؒ فیض یاب ہوئے اور ان سے حضرت احمد عبدالحق رودولویؒ نے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ حضرت احمد کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ عارف مسند نشین ہوئے اور ان کے جانشین ان کے فرزند شیخ محمد ہوئے۔ آخر الذکر بزرگ سے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے فیض پایا۔ شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا سلسلہ بیعت چند واسطوں سے حضرت عبدالقدوس سے جا ملتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

---

[1] مسلم وقف بورڈ ہریانہ کی غفلت اور نالائقی کے سبب حضرت شمس الدین ترکؒ کے مزار کو ایک سکھ نے گوردوارے میں تبدیل کر دیا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی مکہ مکرمہ جاکر حاجی صاحب سے فیض یاب ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے علوم ظاہری کی تحصیل حضرت نانوتویؒ سے اور علوم باطنی کی تعلیم حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر مکمل کی تھی۔ یہ محض حسنِ اتفاق نہیں کہ گذشتہ ایک صدی میں جن بزرگوں نے برعظیم پاک و ہند میں تجدید دین کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا روحانی تعلق حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ سے تھا۔

کلیر شریف سے میں رکشا میں سوار ہوکر رڑکی پہنچا۔ رڑکی بڑا صاف ستھرا شہر ہے۔ برطانوی عہد میں انجینئرنگ کالج ہوا کرتا تھا۔ اب یہ کالج ترقی کرکے یونیورسٹی بن گیا ہے۔ اس شہر میں ایک بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔

رڑکی کے بس اسٹینڈ سے مجھے منگلور جانے والی بس مل گئی۔ رڑکی سے منگلور کا فاصلہ پانچ میل ہے اور کرایہ صرف ستّر پیسے۔ چند منٹوں میں میں منگلور پہنچ گیا۔

اس تاریخی قصبے کی آبادی ۲۷ ہزار ہے اور اس میں مسلمانوں کا تناسب ستر فیصد ہے۔ وہاں ایک انٹرمیڈیٹ کالج بھی ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی دینی مدرسے بھی ہیں ایک جگہ "توسیع تعلیم دیہاتی کتب خانہ" کا بورڈ بھی نظر آیا۔

بس سے اترتے ہی مجھے ایک رکشا مل گیا جو شاہ محی الدین صاحب کے عالی شان بنگلے پر لے گیا۔ اس بنگلے سے ملحق ایک وسیع و عریض مسجد کے صحن میں شمالی جانب قاضی محمد اسمٰعیل (م ۱۸۶۲ء) ان کے جانشین قاضی عبدالغنی منگلوریؒ (م ۱۹۲۸ء) اور ان کے فرزند قاضی عبدالولی (م ۱۹۸۱ء) کی کچی قبریں ہیں۔ قاضی محمد اسمٰعیل صاحب کو میانجی نور محمد جھنجھانوی کے خلیفۂ ارشد شیخ محمد تھانویؒ سے خرقۂ خلافت ملا تھا۔ قاضی صاحب کی وفات کے وقت حضرت عبدالغنیؒ کی حالت اچھی نہ تھی۔ لیکن انہوں نے جلد ہی مجاہدہ و ریاضت کرکے خود کو اپنے والد بزرگوار کا صحیح جانشین ثابت کردکھایا۔ ان کی دونوں حالتوں کا ذکر سید عبدالحیٔ لکھنویؒ نے "دہلی اور اس کے اطراف" میں بھی کیا ہے۔

قاضی عبدالغنی منگلوریؒ۔ اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے والد ماجد ڈاکٹر ابرار حسین کے مرشد تھے۔ خود مولانا اکبرآبادی ان ہی کی دعا سے پیدا ہوئے تھے جگرؔ نے ایک شعر میں اپنے مرشد گرامی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

پابندِ شریعت نبیؐ ہوں　　　خاکِ درِ دولت غنی ہوں

"شجرۂ مبارکہ سادات کاظمیہ منگلور" میں قاضی عبدالغنیؒ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

موجودہ سجادہ نشین شاہ محی الدین صاحب علی گڑھ کے گریجوایٹ ہیں۔ یوپی اسمبلی کے رکن اور صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو موصوف اپنے بنگلے ....

کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑی محبت سے پیش آئے اور کھانے کے متعلق دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں سفر میں زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ انہوں نے کھانے پر اصرار کیا اور ایک ملازم بڑا اپرتکلف کھانا لے آیا۔ کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو فرمانے لگے کہ چائے پی کر جایئے گا۔ وہی ملازم تھوڑی دیر میں چائے لے آیا اور چائے سے فراغت کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی۔ میں ان کے کریمانہ اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔

منگلور بڑا تاریخی قصبہ ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ وہاں تشریف لے جا چکے ہیں۔ سید عبدالحی لکھنوی "دہلی اور اس کے اطراف" میں تحریر فرماتے ہیں کہ جن قصبوں میں سیدؒ صاحب اور ان کے رفقاء نے قدم رنجہ فرمایا وہ آج تک سرسبز و شاداب اور خوب آباد ہیں۔ اور جہاں ان کی مخالفت ہوئی وہ قصبات اُجڑ گئے۔ منگلور کو دیکھ کر یہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ شجرۂ مبارکہ کاظمیہ میں سیدؒ صاحب کے قافلے کی منگلور میں آمد کی بڑی لمبی چوڑی تفصیل درج ہے۔

جناب طفیل احمد منگلوری، جن کی تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" اب کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اسی بابرکت قصبے کے رہنے والے تھے۔ مولانا محبوب الٰہی منگلوری، استاد مدرسہ فتحپوری جو خانقاہ سراجیہ کندیاں کے بزرگوں کے دامن سے وابستہ تھے اسی بابرکت قصبے کے رہنے والے تھے۔

منگلور سے میں دوبارہ رڑکی آیا اور وہاں سے چھٹمل پور کے راستے سہارنپور پہنچ گیا۔ میں نے اپنی قیام گاہ پر نماز عصر ادا کی اور سامان اٹھا کر دیرہ دون جانے والی بس میں سوار ہو گیا اور تقریباً سوا گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ بس اسٹینڈ سے تھوڑے فاصلے پر ایک نو تعمیر ہوٹل میں، جو آکاش دیپ کے نام سے موسوم ہے، قیام کیا۔ اگلے روز میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ہردوار جانے والی بس میں سوار ہوا اور ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔

ہردوار ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے اس مقام پر دریائے گنگا پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ گنگا کے کنارے دور تک ہوٹلوں اور مکانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور دریا کا پانی مکانوں کو چھو کر آگے جاتا ہے۔ ہند کے ہنود اپنے مُردوں کی ہڈیاں اسی مقام پر گنگا میں بہاتے ہیں۔ اس لئے گھاٹوں پر ہر وقت میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ہردوار میں پانی کا بہاؤ بڑا تیز ہے۔ اس لئے اشنان کرنے والوں کی حفاظت کے لئے گھاٹ پر لوہے کے موٹے موٹے زنجیر لٹکے ہوئے ہیں اور یاتری انہیں پکڑ کر دریا میں اشنان کرتے ہیں۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ گنگا میں اشنان کرنے سے پاپ (گناہ) دُھل جاتے ہیں۔

ان گھاٹوں پر بے حیائی کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ پنجاب کی ہندو عورتیں عموماً کپڑوں سمیت اشنان

کرتی ہیں۔ لیکن اضلاع پورب کی عورتیں نیم عریاں ہوکر اپنے جسم پر پانی بہاتی ہیں۔ ان بدبختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگ انہیں عریاں حالت میں دیکھیں گے اتنے ہی ان کے پاپ دُھلیں گے۔

ہردوار کے مقام پر دریا میں ایک جزیرہ ہے جس کے کناروں کو پختہ کرکے اُسے ایک پُل کے ذریعے دریا کے ایک کنارے سے ملا دیا ہے۔ اس جزیرے کا گھاٹ "ہر کی پوڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ اور وہاں اشنان کرنا باعث نجات سمجھا جاتا ہے۔ میں نے بہت سے یاتریوں کو دیکھا کہ وہ ڈھاک کے پتوں سے بنے ہوئے دُونوں میں پھول رکھ کر دریا میں بہا رہے تھے۔ رات کے وقت پھولوں کے ساتھ ایک چراغ جلا کر بھی رکھ دیتے ہیں۔

میں نے پل کے قریب پھیری لگا کر سودا بیچنے والے ایک ہندو سے "ہر کی پوڑی" کا اتہ پتہ پوچھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا کسی اور سے اس کے بارے میں سوال نہ کیجئے گا۔ وہاں برہمن بیٹھے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہیئے گا۔

دریا کے کنارے لکڑی کے تخت پوشوں پر پنڈت چھتر لگائے بیٹھے تھے جب کوئی شخص کسی عزیز کے پھول (ہڈیاں) لے کر گنگا میں بہانے جاتا ہے تو یہی پنڈت مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور اس کا اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ مسوری کے ایک سفر میں ایک ہندو نے جو اپنی ماں کے پھول لے کر ہردوار آیا تھا مجھے بتایا کہ برہمن چھ سات سو روپے تک وصول کر لیتے ہیں۔

دریا کے کنارے کم گہرے پانی میں ایک مندر ہے۔ وہاں پانی کی سطح تو پانچ فٹ کے قریب ہے لیکن پانی کا دھارا بڑا تیز ہے۔ اس کے باوجود میں نے کئی مردوں اور عورتوں کو اس مندر کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ دریا کے کنارے پر مُردوں کے لواحقین مستحقین کو کھانا کھلانے میں مصروف تھے۔ آوارہ گایوں کی بھی وہاں کمی نہ تھی۔ ان کی سیوا بھی ہندو دھرم کا جزو ہے۔ ایسی جگہ پر بندر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان کا نسبی تعلق چونکہ ہنومان سے ہے اس لئے ہنود ان کی بھی تعظیم کرتے ہیں۔

ہردوار شہر کے ایک طرف بڑا اونچا پہاڑ ہے۔ اور اس کی چوٹی پر منسا دیوی کا مندر ہے۔ وہاں تک جانے کے لئے ایو بیہ جیسی لفٹ چیئر استعمال کرتے ہیں۔ آمد و رفت کا کرایہ صرف چار روپے ہے۔

ہردوار میں دریا کے پار ایک ایسا علاقہ بھی ہے جہاں مادر زاد ننگے سادھو سینکڑوں کی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان کے عقیدت مند ہندو مرد اور عورتیں پھل اور مرغن کھانے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنے دل کی مراد پانے کے لئے گھنٹوں ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا حیا سوز منظر دیکھنے

ہیں آئے گا۔ لیکن مذہبی عقیدت بھی عجب چیز ہے۔

میں نے ہردوار میں ہندوؤں کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے دیکھا اور اس بات پر غور کیا کہ رڑکی سے ہردوار جانے والے راستے پر کلیر شریف پڑتا ہے۔ حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ کی حیات میں جو یاتری ہردوار جاتے ہوں گے وہ سرِراہ ان کی زیارت سے مشرف ہوتے ہوں گے۔ اور اب ان کی درگاہ کے پاس سے گزر جاتے ہیں آج بھی ایسے ہی کسی مخدوم کی اشد ضرورت ہے جو وہاں توحید کا پرچم بلند کر سکے۔

ہردوار کا ریلوے اسٹیشن دُور سے مندر معلوم ہوتا ہے۔ بنارس کے ریلوے اسٹیشن کا طرزِ تعمیر بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ ہردوار سے بذریعہ ریل یا بس رشی کیش جاتے ہیں وہاں تک بس کا صرف چالیس منٹ کا سفر ہے۔ یہاں بھی گنگا کے کنارے مندر اور مکانات قابلِ دید ہیں۔ رشی کیش سے تین میل آگے ایک پُرفضا مقام لچھمن جھولا کے نام سے موسوم ہے ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ جب لچھمن تپ دق میں مبتلا ہوا تھا تو وہ بحالیٔ صحت کے لئے یہاں چلا آیا تھا۔ گنگا کے کنارے مکانات کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اور دریا کا پانی برآمدوں میں چلا جاتا ہے۔ مکانوں کے عقب میں ایک سرسبز پہاڑ ہے ایسی پرفضا جگہ شاید ہی کہیں ہو۔ دریا عبور کرنے کے لئے لوہے کے رسّوں کا جھولا نما پل بنا ہوا ہے ہندوؤں نے اسے ہی لچھمن جھولا سمجھ لیا ہے۔

رشی کیش سے مجھے براہِ راست دہرہ دون جانے والی بس مل گئی اور میں تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا اگلے روز میں نے مسوری جانے کا پروگرام بنایا۔ دہرہ دون سے مسوری کا فاصلہ بائیس میل ہے اور بس دو گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ مسوری بہت ہی خوبصورت پہاڑی مقام ہے اور وہاں سے دہرہ دون صاف نظر آتا ہے۔ شہر میں چار مسجدیں ہیں اور شمال مغربی یوپی کے کھاتے پیتے مسلمان رمضان گذارنے کے لئے وہاں چلے جاتے ہیں۔ میں نے پورا دن مسوری میں گذارا اور شام ہوتے ہی دہرہ دون چلا آیا۔

اگلی صبح میں دہرہ دون سے رڑکی گیا اور وہاں سے منگلور کے راستے دیوبند پہنچ گیا۔ منگلور سے دیوبند تک سڑک بڑی خراب ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے دیہات اور کھیتوں میں سے ہو کر جاتی ہے۔ میں بس اسٹینڈ سے سیدھا دارالعلوم کے مہمان خانے میں پہنچا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی دوپہر کا کھانا تناول کر کے قیلولہ فرما رہے تھے۔ میں نے انہیں جگایا اور انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا۔ اور چند طالب علم رہنماؤں سے میرا تعارف کرایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں مولانا ظفر الدین مفتاحی سے ملنے گیا اور انہیں ساتھ لے کر خطۂ صالحین میں اکابر کے مزاروں پر حاضری دی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر تمام کتبے نقل کر لئے اور الواح الصنادید کے عنوان سے ماہنامہ بینات کراچی میں شائع کرا دئے۔